

اخلاق و فلسفہ اخلاق

از مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سہاروی

ذیل کا مضمون مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب کی کتاب ”اخلاق و فلسفہ اخلاق“ سے ماخوذ ہے جو بڑے سائز کے تقریباً ۵۸۰ صفحات پر مددۃ المصنفین کی طرف سے عنقریب شائع ہونے والی ہے، یہ کتاب ”اخلاق و فلسفہ اخلاق“ اور اسلامی اخلاق کی برتری و فضیلت پر ہماری زبان میں پہلی کتاب ہے، ذیل کے مختصر مضمون سے اصل کتاب کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ تو نہیں ہو سکتا تاہم اس سے ایک حد تک مباحث کتاب پر روشنی پڑتی ہے

مدبرہان“

اسلامی نظریہ

گذشتہ ابواب میں اخلاق، نظریہ اخلاق اور فلسفہ اخلاق پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ مگر اس چوتھے باب کے اضافہ کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ”علم الاخلاق“ کے طالب کے سامنے دو حقیقتوں کا اظہار صراحت کے ساتھ ہو جائے، اور اخلاقی مباحث میں بعض حقائق پر جو پڑے پڑے ہوئے ہیں وہ روشنی میں آجائیں۔

(۱) موجودہ علمی ترقی کے دور میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ ”علم الاخلاق“ نے اجتماعی اخلاق کے سلسلہ میں جو ترقی کی ہے وہ جدید نظریوں کی مرہون منت ہے اور ”علم الاجتماع“ کی

تدرین و ترتیب کی بدولت عالم وجود میں آئی ہے، اور اس سے قبل ان مسائل کا وجود مذہبی علم الاخلاق میں نہیں پایا جاتا۔

اس کتاب کے بعض نقل کردہ اقوال سے بھی ترشح ہوتا ہے لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جدید علم الاخلاق سے کہ جس کی عمر زیادہ سے زیادہ دو صدی کے اندر محدود ہے صدیوں پہلے علماء اسلام نے تصوف و اخلاق کے نام سے جو تصانیف کی ہیں اُس کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اصول و مبادی اخلاق کا کوئی جدید شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس قدیم لٹریچر میں تفصیلی حقائق کے ساتھ موجود نہ ہو، البتہ طرزِ ادا، طریق استدلال، وضع اصطلاحات، تعبیر نظریات میں کچھ ایسا فرق ہو گیا ہے کہ ایک ہی حقیقت کا اظہار جب ”اسلامی لٹریچر میں کیا جاتا ہے تو وہ ایسی خاص شکل و صورت میں ہوتا ہے کہ وہی حقیقت جب ”جدید علم الاخلاق“ میں نظر آتی ہے تو نئے قالب اور نئی صورت کے ساتھ اس طرح آشکارا ہوتی ہے کہ گویا یہ ایک نئی اور انوکھی چیز ہے اور اس کا آب و رنگ ہی جدا ہے۔

یہ غلط فہمی اُس وقت اور بھی زیادہ قوی ہو جاتی ہے جب خود اس علم کے اہل ثروت (مسلمان) اپنی پونجی سے نا آشنا رخص ہوتے، اور اپنی ہی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے دوسروں کے سکوں کو دیکھ کر حسرت و افسوس کے ساتھ اپنی تہی دامنی کا اعتراف کر لیتے ہیں، اور جوش و یقین اور مرحومیت کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں کہ ”علم الاخلاق“ کے یہ جواہر ریزے یورپ کے جدید علمی اکتشافات ہی کا نتیجہ ہیں۔

اس کا قدرتی اثر طبائع پر یہ پڑتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر ”اسلامی علوم اخلاق“ سے سرد مہری برتاؤ، بلکہ عربی و فارسی زبان سے نادانیت کی وجہ سے ”جن میں یہ جواہر پائے محفوظ ہیں“ نظر حشرات سے پیش آتا ہے اور اپنی مذہبی علوم سے نادانی کو جدید علوم کی معلومات عامہ کے

پر وہ میں چھپانے کی سعی کرتا ہے۔

دوسری جانب ایک ایسا طبقہ ہے جو اگرچہ جدید علوم سے مرعوب ہو کر اپنے ذخیرہ علم کو نظر حجاز سے تو نہیں دیکھا مگر جہل و نادانی میں پہلے طبقہ سے بھی آگے رہتا ہے، اُس کو مذہب سے شینگی ضرور ہوتی ہے لیکن وہ مذہبی علوم خصوصاً علوم اخلاق سے یکسر بیگانہ اور نادان واقف ہوتا ہے، اور ساتھ ہی جدید علوم سے بے بہرہ۔ وہ ان حقائق کو نہ خود سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو سمجھانے کے قابل بنتا ہے بلکہ ایک ایسی تقلید جاد پر فطانت کر لیتا ہے جہاں جن اعتقاد کے علاوہ علم و عمل کی روشنی سے خودی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

تو ان امور نا بہتر کے پیش نظر کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ جن حقائق علمیہ کو گذشتہ ابواب میں علمی نظریوں، اور عملی نظام کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، ایک مستقل باب میں اُن سے متعلق علماء اسلام کے مباحث کو بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں بیان کر دیا جائے تاکہ علم کی حقیقی روشنی جو قدیم و جدید کے فرق سے اپنی حقیقت کبھی تبدیل نہیں کرتی "اسلامی رنگ" میں بھی واضح ہو جائے اور اگرچہ جتہ جتہ یہ خدمت گذشتہ ابواب میں بھی انجام پاتی رہی ہو تاہم مستقل عنوان بن کر دونوں قسم کے طالبان علوم اخلاقی کے سامنے یہ مستور حقیقت بھی روشنی میں آجائے کہ اس راہ میں بھی اسلام کا دامن کس قدر وسیع اور اُس کی تعلیم کا پایہ کس درجہ بلند ہے اور یہ کہ علماء اسلام نے "علم الاخلاق" کے انفرادی و اجتماعی دونوں گوشوں کی خدمت کس دست نظر، بندی فکر، اور عملی تجربات و مشاہدات کے ساتھ انجام دی ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ ایک جانب ظن و عقل کو دلائل اور ادہام کی آئینش سے متاثر نتائج ہیں اور دوسری جانب حقائق و یقینیات کی قوت اور وحی الہی کے زیر اثر حکم اور روشن احکامات ہیں۔

(۲) اسلام، دراصل صحیح عقائد و انکار، کریمانہ اخلاق، اور اعمالِ حسنہ کے مجموعہ کمال

کا نام ہے۔ یعنی ایک انسان اگر خدا کی وحدانیت کا یقین رکھتا، اور شرک سے بیزاری ظاہر کرتا ہے

تو جس طرح یہ ایک مذہبی عقیدہ ہے اسلام کی نگاہ میں اسی طرح یہ ایک کریمانہ خلق ہے جو بندہ کو اپنے خدا کے ادارہ فرض میں اختیار کرنا ضروری ہے۔ اور اگر وہ توحید کا منکر ہے تو وہ خدا کے تعالیٰ کے ان حقوق و فرائض کے اعتبار سے جو بندہ ہونے کی حیثیت سے اُس پر عائد ہیں، بد اخلاق بھی ہے اسی طرح دوسرے عقائد کا حال ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اگر مسلمی واجبات و فرائض ہیں تو بلاشبہ ان کا تارک مذہبی نقطہ نگاہ سے "بد اخلاق" بھی ہے اگرچہ علم الاخلاق کی عام بول چال میں وہ کریم الاخلاق ہی کیوں نہ شمار ہوتا ہو۔ نیز بہت سے ایسے مذہبی احکام ہیں جو اگرچہ اخلاق کی عام صف میں بھی جگہ پاتے ہیں مگر مذہبی نقطہ نگاہ سے اس لئے واجب العمل ہیں کہ وہ احکام الہی ہیں اور فرائض مذہبی۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ "علم الاخلاق" کا اسلامی نقطہ نظر عام علمی نقطہ نظر سے زیادہ وسیع زیادہ بلند، اور آل و انجام کے اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط و مستحکم ہے اس لئے کہ علم الاخلاق کا علمی نظریہ ایک صاحب اخلاق کو لذت، سادت، منفعت، یا خیر کی اُس مثل اعلیٰ تک ہی پہنچا دینے کا کفیل ہے جو فانی دنیا کے دائرہ میں محدود ہے۔ لیکن اسلامی علم الاخلاق کی کفالت و ضمانت کا رشتہ ہر قسم کی دنیوی سادتوں کی کفالت کے ساتھ ساتھ ابدی و سرمدی سادت و خیر کی مثل اعلیٰ تک رسائی سے ہی وابستہ ہے جو مذہبی زبان میں "عالم آخرت" "عالم روحانیت اور وصول الی اللہ" کے عنوانات سے معنون ہے۔ تو ایسی صورت میں ہم کو یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اسلامی نقطہ نظر سے اخلاق کا علمی و عملی پہلو "جدید علم الاخلاق" کے نظریات و عملیات کی حدود سے بہت آگے اور خصوصی اساس و بنیاد کے اعتبار سے بلند تر ہے۔ اس لئے یہ سچی تو بیکار ہوگی کہ ہم کو روانہ تعلید کے ساتھ اس سلسلہ کے ہر شعبہ میں خواہ مخواہ دونوں کے ہم آہنگ ہونے کا ثبوت دیں، کیونکہ اخلاق اسلامی کو عقائد اسلامی سے بالکل جدا کر لینا اُس کی اصل حقیقت کو فنا کر دینے کے مرادف ہے۔ البتہ یہ اقدام مستحسن اور صحیح ہوگا کہ اس موقع پر ہم اخلاق اسلامی کے صرف ان ہی شعبوں کو بیان کریں جو مذہب کے ساتھ ساتھ

عام علم و عقل کی نگاہ میں بھی "علم الاخلاق" کے شعبے شمار ہوتے ہیں۔ اور جبکہ اسلام اس کا مدعی ہے اور
 بجا طور پر مدعی ہے کہ وہ دینِ فطرت ہے اور صحیح عقل اور آزادیِ افکار کا مذہب ہے تو بلاشبہ
 اُس کے علم الاخلاق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہونا چاہئے جو عقلِ سلیم اور افکارِ صحیح سے متصادم اور اسکے مخالف ہو
 اگرچہ اُس کے بعض شعبے اُن کی دسترس سے آگے اور مادی حیات سے ماوراء بھی ہوں۔ اور عقائد و
 احکام کا وہ مخصوص باب جو اسلامی علم الاخلاق کی خصوصیات میں سے ہے علم کلام و عقائد کیلئے چھوڑ دینا
 مناسب ہی نہیں جس منزل سے ہم گزرنا چاہتے ہیں اگر ان دو حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کر گزرنے کی کوشش
 کریں گے تو انشاء اللہ حصولِ مقصد میں ناکام نہ رہیں گے۔

بہر حال زیر بحث باب میں صرف یہی امور قابلِ تذکرہ ہیں جن میں سے ایک "علم الاخلاق اور
 علماء اسلام" کے عنوان سے معنون ہوگا، اور دوسرا "اسلامی عملی اخلاق" کے عنوان سے۔ اور ان
 ہی کے ذریعہ سے "علم الاخلاق" کے تمام مباحثِ علمی و عملی کی ماہیت اور حقیقت آشکارا ہو جائیگی

علمِ اخلاق اور علماء اسلام

"علم الاخلاق" تعلیماتِ اسلامی کا ایک اہم جز ہے اور جس طرح اُس کے قوانینِ دینی و
 دنیوی ہر گوشہ میں کامل و مکمل ہیں اسی طرح اس گوشہ میں بھی یہ ایک بے نظیر اور بلند مرتبہ "قانون"
 کا پینچا مبر ہے۔

اسلام کے داعی اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا سب سے بڑا مقصد اسی
 "اخلاق" کے "عودِ کامل" کو بتایا ہے۔

۱۲۱ بعثت لا تمم مکارم ۱۲۱ اخلاق ۱۲۱ میں اسلئے بیجا گیا ہوں کہ اخلاق کریمانہ کو ان کی

آخری بندیاں کہنا چاہوں

اور قرآن عزیز نے آپ کے لئے سب سے بڑا شرف اسی کو قرار دیا ہے

۱۰ انک لعلیٰ اخلق عظیم بلاشبہ آپ عظیم اشان اخلاق کریمانہ کے حامل ہیں

”اخلاق“ کے بارہ میں دو قدیم کے فلاسفہ یونان، اور دو جدید کے فلاسفہ یورپ کے جن نظریوں اور عملیوں کا صفحات گذشتہ میں ذکر ہوا ہے، وہاں اگرچہ ضمناً یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ اسلام کا نظریہ اخلاق ازمنہ قدیم و جدید کے نظریوں سے زیادہ بلند اور زیادہ مکمل ہے۔ اور اگرچہ موجودہ دور علمی میں ”علم الاخلاق“ کو مباحث ”علم الاجتماع“ کو نقطہ نظر سے بہت پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں تاہم اصل اور بنیاد کے حقیقی انادہ کے پیش نظر علمی و عملی دونوں گوشوں میں علماء اسلام کے مباحث اخلاق سے آج بھی آگے نہیں ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ”علم الاخلاق“ کے بارہ میں علماء اسلام کے نظریوں کو قدرے تفصیل سے بیان کر دیا جائے

تعریف

امام غزالی کا نظریہ | امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ”خلق“ کی حسب ذیل تعریف کی ہے :-

”خلق“ نفس کی ایک ایسی کیفیت اور ہیئت راسخ کا نام ہے کہ اُس کی وجہ سے بہ سہولت اور کسی فکر اور توجہ کے بغیر سے اعمال کا صدور ہو سکے۔ پس اگر یہ ہیئت اس طرح قائم ہے کہ اُس سے عقل و شرع کی نظر میں اعمال حسنہ صادر ہوتے ہیں تو اُس کا نام ”خلق حسن“ ہے اور اگر اُس سے غیر محمود اعمال کا صدور ہوتا ہے تو اُس کو ”خلق سخی“ اور ”بد اخلاقی“ کہتے ہیں۔

اور آگے چل کر فرماتے ہیں۔

”خلق“ نیک و بد عمل، اُس پر قدرت، اور نیک و بد عمل کی تجویز کا نام نہیں بلکہ اُس ہیئت و صورت کا نام ہے جس سے نفس میں ضبط و اقدام کی استعداد پیدا ہو جائے۔

لے ایچ اے اسلام جلد ۲ صفحہ ۵۶

اس لئے خلقِ نفس کی ایک باطنی صورت و ہیئت کا نام ہے۔

شاہ ولی اللہ کا نظریہ | اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ شارع نے انسان کو ایجاب و تحریم کا جس بنا پر تکلف بنایا ہے وہ اعمال ہیں جن کی تحریک، نفس کی اُن کیفیات کے ذریعہ ہوتی ہے جو عالمِ آخرت میں نفس کے لئے مفید یا مضر ثابت ہونگی۔

اس قسم کے اعمال سے دو طرح بحث کی جاتی ہے ایک یہ کہ اُن اعمال سے اس حیثیت میں بحث کی جائے کہ وہ انسانی نفوس کو مذہب بنانے کا ذریعہ ہیں اور ان اعمال سے جو ملکاتِ فاضلہ مقصود ہیں اُن تک نفس کو پہنچانے کا آلہ ہیں اسی کو علم الاحسان (علم الاخلاق) کہتے ہیں اور صاحبِ منازل کا قول ہے کہ :-

”خلق“ انسان کی اُس کیفیت کا نام ہے جو اُس کی طبیعت کے مختلف اوصاف و حالات کو جدوجہد کر کے اپنی جانب راجع کر لے۔
ایک شاعر کہتا ہے :-

ان الخلق یاتی دونہ خلق (یعنی) آدل ایک چیز کی عادت ڈالی جاتی ہے اور بعد میں وہ ہی ”خلق“ بن جاتی ہے۔

غرض و غایت

اخلاق کی غرض و غایت | شاہ ولی اللہ دہلوی ”اخلاق“ کی غرض و غایت، سعادتِ حقیقی کا حصول اور مثلِ اعلیٰ تک رسائی سمجھتے ہیں اور سعادت ”پرا یک مستقل بحث فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

یہ واضح رہے کہ انسان میں ایک بہت بڑا کمال و دلچسپی ہے جس کا تقاضہ اُس کی صورت
 زویرہ کرتی ہے یعنی انسان جس ہیئت و صورت کی وجہ سے انسان کہلاتا ہے اُس کا تقاضہ
 ہے کہ اُس میں یہ عظیم الشان کمال موجود ہو جس سے تمام مخلوق محروم ہے۔ اور اسی کا نام
 سعادت حقیقی ہے۔

سعادت

دراصل انسان کی قوتِ بہیمیہ کا نفسِ ناطقہ کے، اور خواہشاتِ نفسِ کا عقلِ کابل کے زیر
 اثر ہو جانا۔ سعادت، کہلاتا ہے۔

اور مقامِ تحقیق یہ ہے کہ سعادت حقیقی، عبادتِ الہیہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اسی لئے
 مصباحِ کلّیہ کا یہ تقاضہ ہے اور وہ افرادِ انسانی کو، زرعِ انسانی کے فرد، ہونیکلی حیثیت سے
 اس کی دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنی صفات کی اصلاح کرے کیونکہ یہ دوسرے درجہ کا
 کمال ہے اور اول درجہ کا کمال اسی راہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ کہ انسان کو اپنی
 ہمت کی نایتِ قصویٰ، اور اپنی نظرِ بصیرت کی، نہایتِ عظمیٰ، صرف تہذیبِ نفس کو
 بنانا چاہئے اور نفس کو ان ہستیوں اور کیفیتوں سے مزین کرنا چاہئے جو ملاِ اعلیٰ سے ملتی
 جلتی ہوں اور جن کی وجہ سے اُس پر عالمِ ملکوت کے فیضان کی بارش ہونے لگے۔

سعادت کے درجات | شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ بھی ہے کہ انسان، درجاتِ سعادت

میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق مختلف ہیں۔ فرماتے ہیں۔

انسان، عام اخلاق مثلاً شجاعت وغیرہ میں مختلف ہیں، بعض وہ ہیں جو اخلاق کے خلاف

خراب عادت و جبلت رکھنے کی وجہ سے اُس سے قطعاً محروم رہتے ہیں، اور ان میں

۱۵ مخقر از حجۃ اللہ جلد اول باب حقیقتہ السعادتہ صفحہ ۵۰، ۵۱

حصولِ سعادت کی اُمید ناممکن ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی خلقتی ضعیف القلب کا صفتِ شجاعت سے محروم ہو جانا۔

اور بعض میں اگرچہ اُس کا بالفعل وجود نہ ہو مگر افعال و اقوال کی مسلسل رفتار، ہیئات اور احوال کے اثرات کا تاثر اور مناسب حالات کے وجود کی وجہ سے اس کا حصول متوقع ہوتا ہے اور اربابِ مثلِ اعلیٰ اور مصلحین قوم کے حالات اور تذکروں اور حوادث و آلام کی مسلسل غیبوں اور اسی طرح کے دیگر امور سے اس کے پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔ اور بعض میں اُس کا وجود بالفعل ہوتا ہے مگر چونکہ وہ چھوٹے چھوٹے تکررات و تلویحات سے بھی دوچار ہوتا رہتا ہے اس لئے درجہ کمال کو نہیں پہنچتا اور جیسا کہ گندہک و آگ سے قریب ہونے میں ہر وقت آگ لگ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اسی طرح اُس کے حصولِ سعادت سے محروم رہنے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔

اور بعض میں اُس کا وجود درجہ کمال اور خط وافر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ موانع اور رکاوٹیں اگر آڑے بھی آئیں تو وہ اُن سب کو عبور کر کے کمال کے انتہائی درجہ کو حاصل کر لیتا ہے اور بغیر کسی تحریک اور دعوتِ درہم کے اُس کے لئے وہ طبعی چیز بن جاتی ہے۔

یہ علم الاخلاق میں "امامت" کا وہ درجہ ہے جس سے اوپر کوئی اور امامت نہیں ہے، اس لئے ضروری ہے کہ جو اس سے نیچے کے درجات ہیں اُن کے اصحاب درجاتِ اُسکی پر دی کریں اور اُس کے اقتدار کو فرض جانیں۔ بہر حال جس طرح انسان، ان علمِ اخلاق میں مختلف درجات رکھتا ہے جو اس کی "سعادت" اور مثلِ اعلیٰ کا "مدار" ہیں۔

چنانچہ بعض انسان اپنی خلقت و جبلت کی افادہ ہی میں اُس سے محروم ہیں، اسی

گردہ کے لئے ارشاد ہے

صُمُّ بَلْمٌ عُمِّيٌّ فَهْمٌ لَا يَرْجُونَ
بہرے ہیں گوگنے ہیں ائمہ ہیں بس یہ حق کی جانب
ہرگز نہ بڑھیں گے۔

اور بعض میں اگرچہ بالفعل ان اخلاق کا وجود نظر نہیں آتا لیکن سخت محنت اور شدید ریاضات سے ان کا حصول متوقع ہے ان ہی کو دعوت و محرکات کی ضرورت ہے اور انسانوں کے نام افراد اسی درجہ پر قائم ہیں اور انبیاءِ عظیم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت و تبلیغ کا یہی مجوزہ مرکز ہے، اور ان کی بعثت کا مقصد ادلین انہی کی اصلاح و تربیت ہے۔

اور بعض میں ان کا وجود اجالی صورت میں ہوتا ہے اور اندر ہی اندر اُس میں شانیں پھوٹی رہتی ہیں مگر اُن کی تفصیلات اور اجمال کے بسط و کشاد میں کسی امام کے محتاج رہتے، اور اس کی راہنمائی کی پناہ چاہتے ہیں۔

ان کا حال بالکل ایسا ہے۔

یکا دنس یتہا یضیٰ دولمہ تمسہ نار قریب ہے کہ اُس کا تیل بغیر آگ کے چھوئے ہی روشن ہو جائے۔

یہ افراد اس راہ سعادت کے جوان ہمت و پیش قدمی ہیں اور ان کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے انبیاءِ عظیم السلام علیہم اذکر تے ہیں اور اُن کی راہنمائی کر کے اُن کو حقیقی مثل اعلیٰ اور سعادت کبریٰ تک پہنچاتے ہیں۔

سعادت کے اسباب میں، یعنی اخلاق کا ملکہ تک پہنچنے اور ان میں کمال حاصل کرنے میں دوسرے اور تیسرے درجات کے حاملین جس طرح ائمہ اخلاق اور مصلحین کا ملین کے محتاج نظر آتے ہیں اور انسانی دنیا کی تمام آبادی نبی و رسول کی بعثت، انبیاء و رسل کی اہمیت اور

اشد ضرورت پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہی تفسیر ہے اس حدیث کی "در انما بعثت
لا تمم مکارم الاخلاق"۔

حصولِ سعادت کے طریقے | جبکہ "اخلاق" کا منشا حصولِ سعادت اور حقیقی مثلِ اعلیٰ تک
رسائی ہے اور اُس کے حصول کے لئے مختلف طریقوں میں سے حضرت شاہ صاحب کے نزدیک دو ہی
بہتر طریقے ہیں، فرماتے ہیں۔

معلوم رہے کہ یہ "سعادت" دو طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ خود کو
طبیعتِ بہیمیہ سے بالکل جدا کر لے یعنی طبیعت اور اُس کے جوش کو روکنے کے تمام وسائل
اختیار کرے اور اُس کے علوم و حالات کو سرد کر دے اور اپنی تمام توجہ عالمِ جہات سے
پرے عالمِ ملکوت کی جانب متوجہ کرے اور نفس کو ایسے علوم (علومِ الہی) کے قبول کرنے کی
طرف مائل کرے جو کلیتہً زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوں، اور غلبی اُنس در رغبت،
اور غلبی لذات کے متضاد لذتوں کا نوگر بنے۔ تا آنکہ عوام اور پست خیال انسانوں کی نمیشینی
و اختلاط سے پرہیز کرنے لگے اور اُس کی رغبتیں اُن کی رغبتوں سے جدا اور اُس کا خوف
اُن کے خوف سے الگ شاہراہ پر قائم ہو جائے۔

یہ طریقہ اُن ربانی انسانوں کا ہے جو صوفیہ کے گروہ میں سے حکما اور مجاہدین کا کلام ہے
دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قوتِ بہیمیہ کی اصلاح کی جائے اور اصل قوت کی بقا کے
ساتھ ساتھ اُس کی کچی کو درست کیا جائے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ افعال، کیفیات
اور اذکار کے ذریعہ قوتِ بہیمیہ سے وہ سب کچھ ادا کر لیا جائے جس کا نفسِ ناطقہ
خواہشمند ہو "جس طرح کوئی گونگا دوسرے انسانوں کے اقوال کو اشارتہ کے ذریعہ ادا
کرتا ہے، یعنی عقل، قوتِ بہیمیہ پر حاکم اور غالب ہو جائے، انج

اور حصول سعادت کے اس طریقے سے لوگ عام طور پر دائف و متعارف ہیں اللہ تعالیٰ کو فضل سے
جو فہم و فراست مجھے عطا ہوئی ہے، وہ اسی طرف راہنمائی کرتی ہے کہ اس کا مرجع اور منبع چار
خصائل ہیں اور جب یہ نفسِ ناطقہ اور عقل کے غلبہ سے قوتِ بہیمیہ پر جادی اور طاری
ہو جاتی ہیں تو مقصد "حصول سعادت" حاصل ہو جاتا ہے۔

اور اس حالت میں انسانی کیفیات ملار اعلیٰ کی صفات (ربانی صفات) سے قریب تر اور
زیادہ مشابہ ہو جاتی ہیں، اور انبیاءِ علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اسی کی دعوت و تربیت پر
مبنی ہے اور درحقیقت "شرائع" اور "مذہب" اسی کی تفصیل و تفسیر ہیں اور یہی ان کے
وجود کا حقیقی محور و مرکز ہے۔

وہ چار بنیادی خصائل حسب ذیل ہیں۔

(۱) طہارت (۲) انجبات (۳) سماحت (۴) عدالت

فطرتِ سلیم کے مالک، صحت مزاج کا حامل اور کیفیاتِ سفلیہ و دنیہ سے پاک انسان اگر
دنیوی خواہشات کی تلویث سے ملوث ہوتا ہے تو فطرتِ اُس پر تکدر، ملال، اور تنگ دلی
کا غلاف چڑھا دیتی ہے۔ اُس کی زندگی ان آلودگیوں سے ڈوبتی ہوئی سی نظر آنے لگتی ہے
اور اس حالت میں وہ قوائے بہیمیہ کے امثال کے قریب ہو جاتا ہے اور دساوسِ شیاطین
اُس پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔

پس اگر وہ جلد متنبہ ہو کر ان جسمانی اور روحانی کمزوریوں سے جدا ہو جاتا ہے اور ان سے
صاف ہو کر بے لوث بن جاتا ہے تو غبارِ آلودگی اور کثافتوں سے برتر ہو جانے سے
اُس کی نفسیاتی کیفیات ان روحانی صفات کے مشابہ ہو جاتی ہیں جو "ملار اعلیٰ" سے
قریب ہیں، اور اُس کے ملکاتِ نورانی میں ضیاء اور روشنی چمک اٹھتی ہے اور اس قابل

ہو جاتا ہے کہ قوتِ عملیہ کی استعداد کے مطابق اپنے نفس کو صاحبِ کمال بنا سکے اور اُس میں فرشتوں کے الہامات کے قبول، انوارِ الہی کے ظہور، پاک، طیب، اور مبارک اشیاء کے ساتھ مشابہ ہونے اور دنیا و دین کا بہترین انسان بننے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے انسان کی اسی استعداد و قوت کا نام "طہارت" ہے۔

اور اگر انسان اپنی فطرتِ سلیمہ اور صفاتِ قلب کے ساتھ خدایتالیٰ کی نشانیوں کے ذکر، اُس کی صفات کی فکر، اور اُن سے نصیحت و تذکیر کی جانب متوجہ ہو جائے تو اُس کے نفسِ ناطقہ کو تہہ پیدا ہوتا، اور اُس کے حواس اور اُس کا تمام جسم اُس کا مطیع ہو جاتا ہے اور وہ اپنی اس کیفیت کے وقت تک حیران و در ماندہ ہستی نظر آنے لگتا ہے۔ خود بخود اُس کی توجہ عالمِ قدس کی جانب ہو جاتی ہے، اس حالت پر پہنچ کر وہ خود کو اس طرح بیچارہ اور عاجز دیکھتا ہے جس طرح با اختیار بادشاہ کی درگاہ میں ایک عام اور بے حیثیت انسان۔

اور روحانی حالات میں سے یہ "حالت" "طہارت" کے احوال کے مشابہ، اور روحی درجہ میں سے اُس درجہ سے قریب تر ہے جس میں "روح" اپنے خالق کے جلال و جبروت کی جانب متوجہ، اور اُس کی تقدیر میں مستغرق رہتی ہے۔ اور اس حالت میں نفسِ انسانی اپنے علمی کمالات کی طرف بند پر دازی کے لئے اس طرح مستعد ہو جاتا ہے۔ گویا اُس کے لوحِ ذہن پر معرفتِ کردگار کے نقوش نقش ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو ذوق اور وجدان سے تعلق رکھتی ہے اور جس کا معرض تحریر میں آنا دشوار ہے۔ اسی کیفیت کا نام تصوف و اخلاق کی اصطلاح میں "اخبات" (بخودی) ہے۔ اور اگر نفسِ قوتِ بہیمیہ کے اسباب و دعائی سے باغی ہو جائے۔ اور اُس پر نہ

بہیمیت کے نقوش منقش ہو سکیں اور نہ اُس کے اثرات کا لوٹ اُس تک پہنچ سکے تو اس کا

نام "ساحت" ہے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نفس، جب اپنے دنیوی کاروبار میں مصروف ہوتا اور از دو اجبی زندگی، اور معاشی زندگی سے دوچار ہوتا ہے تو اُس کی دو حالتیں ہوتی ہیں یا وہ ان میں اس طرح مٹھک ہو جاتا ہے کہ پھر اُس کو اُس تنگ راہ سے نکلنا محال ہو جاتا ہے اور یہاں مشغول تو ہوتا ہے لیکن اعتدال کے ساتھ مشغول رہ کر جب فارغ ہوتا ہے تو روح میں ضیق پیدا کرنے والی ان تلویذات سے یکسر جدا ہو جاتا ہے گویا کبھی اُن میں مشغول ہی نہ تھا۔ نفس کی اُس حالت میں جبکہ وہ نفسانی خواہشات سے جدا ہوتا، اور ان عطاقت سے نجات پاتا ہے "انسان" انوارِ ملکوتی سے فریضیاب اور دنیوی ظلمتوں سے پاک نظر آتا ہے اور وہ عالمِ قدس سے مانوس ہو جاتا، اور ابدی و سرمدی مسرت پاتا ہے۔

اور اگر نفس انسانی ایسے ملک سے بہرہ ور ہو کہ اُس سے صرف ایسے ہی افعال صادر ہوتے ہوں کہ جن سے بہ سہولت "اجتماعی اور مدنی نظام" کا صحیح قیام ممکن ہو سکے، اور نفس سے اُن کا صدور خلقتی عادت کی طرح ہوتا رہتا ہو تو ایسے ملک کا نام "درعدالت" (عدل) ہے اس حقیقت کا "راز" یہ ہے کہ "حضرت الیہ کی جانب" سے اصلاحِ نظام کے تمام امور جو اس کی مشیت واردہ میں ہیں "ملائکہ اللہ اور پاک ارواح" پر اس طرح نقش ہو جاتے ہیں جس طرح آئینہ میں شکل و صورت نظر آتی ہے۔

لہذا جب انسان اپنے قوائے سفلیہ و حدیہ کو روح کے تابع کر دیتا ہے تو ایک حد تک وہ کدورتوں سے الگ اور "عالمِ قدس" سے قریب تر ہو جاتا ہے اور صفاتِ حسنہ سے بالاتر ہو کر صفاتِ عالیہ کا الگ بن جاتا ہے۔

اور نفس کی تمام مرضیات اسی ایک نظام کے سانچے میں ڈہل جاتی ہیں اور یہی پوری
 کیفیت دراصل "خالص روح" کی طبیعت و فطرت ہے الخ
 یہی وہ چار بنیادی صفات ہیں جو اگر انسان میں پوری طرح راسخ ہو جائیں اور انسان
 کمالاتِ علمی و عملی کے لئے اُن کی مقتضیات کی کیفیتوں کا فہم حاصل کر لے اور اُس میں
 یہ فطانت پیدا ہو جائے کہ وہ ہر زمانہ کے مذاہب الہیہ کی تفصیلی کیفیات پر آگاہ ہو جائے
 تو بلاشبہ اُس کو "خیر کثیر" حاصل ہے اور یقیناً وہ "فقہ فی الدین" اور دین کے بارے میں
 سمجھدار اکہلانے کا مستحق ہے۔ اور اس مجموعی کیفیت اور حالت کا نام ہی فطرت^۳
 (سعادت) ہے۔

اس تمام تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی - اخلاق کی غایت
 "سعادتِ ابدی" کو سمجھتے ہیں اور سعادت کے اُس درجہ کو جس میں انسان ملکوتی صفات سوشا بہ
 اور حق تعالیٰ کے انوار و فیوض سے قریب تر ہو جاتا ہے حقیقی مثلِ اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں۔
 اور اُن کے یہاں "مثلِ اعلیٰ" کے مختلف درجات ہیں۔ جو حسب استعداد عام صاحبِ اخلاق
 صالحین سے شروع ہو کر انبیاء علیہم السلام کے درجات تک پہنچتے ہیں۔ اور یہ درجہ سب سے بلند اور آخری
 درجہ ہے۔

البتہ "اسلامی نقطہ نظر سے" اس مسئلہ میں اس قدر تفصیل اور ہے کہ "حقیقی مثلِ اعلیٰ" اپنے درجہ
 کمال کے اعتبار سے خواہ آخری درجہ پر کسی شخص کو حاصل بھی ہو جائے تاہم وہ کامل الاخلاق "اکہلانیکا مستحق"

۱۰۰ من یؤتی الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا ۱۰۰ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباس کے

لئے یہ دعویٰ تھی۔ اے اللہ اس کو دین کی سمجھ دے ۱۰۰ کل مولود یولد علی الفطرۃ (المحدث)

۱۰۰ حجۃ اللہ جلد ۱ بحث سعادت صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۵

ہوگا مگر نبی اور رسول نہیں کہلائے گا۔ اس لئے کہ یہ "مقام" انسانی جدوجہد کے دائرہ سے بلند ہے اور صرف خدائے تعالیٰ کی عطا و بخشش پر موقوف ہے گویا یہ ایک "منصب الہی" ہے جو نیابت الہی کی تکمیل کے لئے کسی انسان کے حصہ میں آتا ہے۔ اسی لئے قرآن عزیز میں تصریح کر دی گئی۔

اللَّهُ اعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ اللَّهُ تَعَالَى خَيْرٌ جَانِبًا هُوَ كَمَا دَعَا فِي رِسَالَتِهِ

(الانعام) کا منصب کس کو عطا کرے۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ جو ہستی بھی اس جلیل القدر منصب پر فائز ہو وہ "اخلاق کریمانہ" کے

بلند صفات سے متصف ہونی چاہئے۔

اور ہر شے کے دو زمانوں (آغاز و کمال) کے اعتبار سے اس منصب کا دور کمال اپنی علمی و عملی

برتری کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے وابستہ کر دیا گیا۔ پس آپ کا ارشاد گرامی۔

انِي بَعَثْتُ لَكُمْ حُسْنَ الْاِخْلَاقِ مِثْرَةَ بَعَثْتُ (نبوت و رسالت) اخلاق کریمانہ

و فی روایتہ مکارم اخلاق اور حُسْنِ اخْلَاقِ کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے

اسی حقیقت کا اعلان ہے۔

مطورہ بالا تفصیل سے یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ امام غزالی شاہ ولی اللہ۔ امام راجب اصفہانی

کے نزدیک "سعادت" اور مثل اعلیٰ کا مفہوم اُس سے بلند تر ہے جس کا نظریہ جدید کے ابواب میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے۔

ان علماء اخلاق کے نزدیک دنیوی صلاح و فلاح کے ساتھ حقیقی فلاح و نجات یعنی عالم آخرت

کی سرمدی و ابدی راحت کا حصول بھی ان دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

اور محقق دوانی فرماتے ہیں۔

نفس ناظرہ انسانی میں دو قوتیں ہیں ایک قوت ادراک "دوسرے" قوت تحرک "اور

دو ذوں قوتوں کی پھر جدا جدا شاخیں ہیں۔

قوتِ ادراک کی ایک شاخ کا نام "عقل نظری" ہے اور یہ علمی اسکال کے قبول کیلئے مبدیہ تاثر بنتی ہے۔ اور دوسری شاخ کا نام "عقل عملی" ہے اور یہ افعال خیر کے فکر و مشاہدہ میں تحرک پیدا کرنے کے لئے یہ مبدیہ بعید ہوا کرتی ہے۔ اور پھر یہ شعریہ قوتِ غضب اور قوتِ شہوت سے تعلق کے وقت ایسی چند کیفیات کے وجود کا مبدیہ بنتا ہے جو کسی فعل یا افعال کا سبب بنتی ہوں، مثلاً ندامت، خندہ بکا وغیرہ۔

اور وہم اور قوتِ تخیل کے استعمال کی حیثیت سے جزوی آرا اور جزئی اعمال کے استنباط کا بھی مبدیہ ثابت ہوتی ہے۔

اور "عقل نظری" کے ساتھ نسبت پانے یا دونوں کے باہم یک دگر دالبتہ ہو جانے کی حیثیت سے سبب بن جاتا ہے اُن آرا و کلیتہ کے حصول کا جو اعمال کے ساتھ متعلق ہیں۔

اسی طرح قوتِ تحریک کی پہلی شاخ کا نام "قوتِ عصبی" ہے۔ یہ مبدیہ بنتی ہے ایسی مدافعت کا جو غلبہ کے ساتھ امور نامناسب کو دفع کرتی ہو۔

اور دوسری شاخ کا نام "قوتِ شہوانی" ہے یہ مناسب امور کے حاصل کرنے کیلئے مبدیہ ہے "قوتِ ادراک" کا یہ فرض ہے کہ تمام قویٰ بدنی پر اس طرح مسلط ہو جائے کہ کسی طرح ان قویٰ سے منفصل اور متاثر نہ ہونے پائے بلکہ تمام قویٰ اسی کے تسلط اور قہر انیت میں آجائیں اور یہ جس قوت سے کام لینا چاہے لے سکے اور کسی قوت کو اُس کے حکم کے بغیر کسی قسم کے اقدام کی جرأت باقی نہ رہے تاکہ انسانی ضمیر کی راجدہانی میں نظم و انتظام صحیح رہے اور کسی قسم کا اختلال پیدا نہ ہو۔

لہٰذا تحریک جسم و بدن کے لئے محرک قریب یا خود نفس ہے یا اُس کا ارادہ۔

اور جب ان قوتوں میں سے ہر ایک قوت بمقتضا عقل اپنے خصوصی فعل پر اقدام کرے گی۔ تو قوت ادراک (عقل نظری) کی تہذیب و ترقیب سے حکمت حاصل ہوگی، اور عقل عمل کی تہذیب سے عدالت پیدا ہوگی۔ اور قوت فحشی کی ترقیب و تہذیب سے شجاعت اور قوت شہوی کی تہذیب سے عفت عالم وجود میں آئے گی۔

اس تقریر کی بنا پر عدالت قوت عملی کے کمال کا نام ہے نہ کہ قوت ظہری کے۔

لیکن علماء اخلاق اس مسئلہ کی تقریر ایک دوسرے طریقہ سے بھی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

نفس انسان میں تین قوتیں متضاد موجود ہیں اور "نفس" جس قوت کا ارادہ کرتا ہے اسی

کے مطابق آثار پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور جب ان میں سے ایک غالب آجاتی ہے تو دوسری

بلاشبہ مغلوب یا مفقود ہو جاتی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) قوت ناطقہ۔ اس کو نفس ملکوتی "اور نفس مطمئنہ" بھی کہتے ہیں۔ یہ حقایق امور میں

فکر و نظر کے شوق اور فکر و تہذیب کا مبدیہ بنتی ہے۔

(۲) قوت غضبی۔ اس کو نفس سخی اور نفس لوامہ بھی کہتے ہیں، اور یہ غضب و دلیری،

ہولناکیوں پر اقدام اور سر بلندی و تسلط کے شوق کا مبدیہ ہے۔

(۳) قوت شہوی۔ اس کا نام نفس بہمی اور نفس امارہ بھی ہے۔ اور یہ شہوت، طلب

غذا اور اکل و شرب و نکاح کے ذریعہ حصول لذت کا شوق وغیرہ جیسے امور کا مبدیہ ہے